۱۳

دروازے پر پھر وہی دستک۔ اور میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے۔ جسم جیسے پتھر ہو گیا ہو۔

"اے ہے کانوں میں ڈاٹ لگائے بیٹھے ہو۔ سن نہیں رہے ہو۔ کسی نے بیل دی ہے۔"

"وہی ہو گا۔"

"کون؟"

"وہی پراپرٹی ڈیلر۔ بور کر دیا اس شخص نے۔ دفتر میں ہوتا ہوں تو فون آجاتا ہے اور اتنی لمبی بات کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے ریسیور پٹخ کر باہر نکل جاؤں۔ گھر آؤ تو خود آن دھمکتا ہے۔"

"تم تو بس کامریڈ جیسوں کے ساتھ خوش رہتے ہو جو گوبر کا چوتھ نہ لیپنے جوگا نہ پوتنے جوگا۔ کام کے آدمی سے بھاگتے ہو۔"

اتنے میں پھر بیل ہوئی۔

"اجی جاؤ۔ دیکھو نا۔"

اور میں بیزاری کے عالم میں اٹھا، دروازہ کھولا۔ میرا گمان صحیح تھا۔ وہی پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اسے برآمدے میں بٹھایا۔ زبیدہ نے فوراً چائے بھجوادی۔ زبیدہ اس کی کتنی

تواضع کرنے لگی تھی۔ کامریڈ کی آمد کا تو اس نے کبھی اس طرح نوٹس نہیں لیا تھا۔ مجھے کہنا پڑتا تھا کہ زبیدہ، اپنا کامریڈ آگیا ہے۔ ذرا چائے ہو جائے۔

اس کے چلے جانے کے بعد زبیدہ نے کتنے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا:

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہی اول پٹال باتیں۔ فلاں سکیم میں پلاٹوں کے لیے قرعہ اندازی ہونے والی ہے فلاں علاقہ میں فلاں کوٹھی فروخت ہو رہی ہے۔"

"بخت مارے نے اب بتایا ہے جب قرعہ اندازی ہونے لگی ہے۔ پہلے سے بتایا ہوتا تو ہم بھی فارم داخل کر دیتے۔ اور وہ جو اس نے پہلے کنال بینک کے پلاٹوں کا ذکر کیا تھا ان کے متعلق اب کیا کہتا ہے۔"

"زبیدہ۔ ابھی تو ہم نہیں خرید رہے ہیں۔ جب فیصلہ کر لیں گے آشیانے کو چھوڑ دینا ہے تو پھر معلومات حاصل کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"ایسے معاملوں میں ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جما کرتی ہے۔ ابھی سے معلومات حاصل کرتے رہو گے پھر وقت آنے پہ کچھ ہو سکے گا۔ اور میں کہتی ہوں کہ ہم نہ خریدیں لیکن ہمیں پتہ تو رہنا چاہیے کہ زمینوں کا کیا حال ہے۔ باقی رہی فیصلہ کی بات تو تم تو فیصلہ کر چکے۔ تمہیں بوجان کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیں گی اور اوپر سے اس بخت مارے کامریڈ نے پھٹے میں ٹانگ اڑا دی۔ خود نگھرا پھرتا ہے۔ ہمارے مکان کے لیے اس کے پیٹ میں بہت درد اٹھ رہا ہے۔"

اب یہ روز کا مضمون ٹھہرا تھا۔ دفتر کے اوقات میں فون۔ دفتر کے اوقات کے بعد گھر پہ نازل ہو جانا۔ اس کے جانے کے بعد زبیدہ کی طنز و تعریض سننا۔ اور فون سے اب میں کتنا ڈرنے لگا تھا۔ ایک وقت تھا اور کیا وقت تھا کہ میز پہ رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ میں گویا جان پڑ گئی تھی۔ کتنی زندہ شے نظر آتا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر فون میرے لیے

زندہ چیز بن گیا تھا۔ مگر اب کے دوسرے رنگ سے۔ اب وہ میرے لیے ایک ڈراؤنی چیز تھا۔ فون کی گھنٹی بجی اور میرا دم خشک ہوا۔ کتنا ڈرتے ڈرتے میں فون اٹھاتا تھا۔ یہی کیفیت اس وقت ہوتی تھی جب گیٹ کی بیل بجتی تھی۔ اس شخص کا کتنا ڈر میرے اندر سما گیا تھا۔ جتنی دیر وہ مجھ سے باتیں کرتا رہتا اتنی دیر مجھے یہ خیال رہتا کہ وہ مجھ سے باتیں نہیں کر رہا ہے، میرے اندر جھانک رہا ہے۔ گھات میں بیٹھا ہے کہ میں اب گرا اور اب گرا۔ جب نہیں ہوتا تھا تب بھی یہی وہم رہتا تھا کہ کہیں آس پاس منڈلا رہا ہے۔ کبھی کبھی چلتے چلتے یوں لگتا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے۔ پیدل چلتے ہوئے کتنی مرتبہ مجھے اس وسوسہ نے ستایا اور کتنی مرتبہ میں نے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھا۔

بس اس روز میرا اس سے خوش اخلاقی سے پیش آنا اور چائے سے تواضع کرنا غضب ہو گیا۔ وہ تو اسی روز مجھے کتنے غیر محسوس طور پر راہ پر لے آیا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین وقت پہ کامریڈ آن ٹپکا اور میں بدک گیا۔ اس کے بعد عجب صورت حال پیدا ہوئی۔ جیسے شکار چوکنا ہو گیا ہو اور شکاری اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ میں اب اسے اس طرح دھتکار بھی نہیں سکتا تھا جیسے شروع میں دھتکارا تھا۔ اس سے خائف بھی تھا اس کے اثر میں بھی تھا۔ ایسے اس سے ڈرتا تھا جیسے گائے قصائی سے ڈرتی ہے۔ ایسے اس کی طرف کھنچتا تھا جیسے سانپ سپیرے کی طرف کھنچتا ہے۔

گھر میں اب نقشہ یہ تھا کہ ایک تناتنی کی فضا۔ بوجان اور زبیدہ میں اب بحث تو نہیں ہوتی تھی مگر دونوں ایکدوسرے سے دور دور رہنے لگی تھیں۔ بوجان نے زبیدہ ہی کو نہیں، مجھے بھی اب نصیحت کرنی بند کر دی تھی۔ چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ جب دروازے کی گھنٹی بجتی اور پتہ چلتا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے تو تشویش کی ایک کیفیت ان کے چہرے پر ظاہر ہوتی جسے زبیدہ تو نہیں مگر میں فوراً جان لیتا تھا۔ ویسے منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔

عجب ہوا کہ بوجان کے چپ ہونے کے ساتھ ہمارے گھر میں بھی خاموشی نے ڈیرا کر لیا۔ اس گھر میں بولنے، باتیں کرنے کا سلسلہ تو بوجان ہی کی کسی بات سے شروع ہوتا تھا۔ اے دلہن۔ اے بیٹے۔ اے لال۔ کبھی نہ بیدہ سے خطاب کبھی مجھ سے خطاب۔ بس پھر شروع ہو جاتی تھیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ اگلے پچھلے قصے، کب کب کی کہانیاں۔ ایک ان کے دم سے کتنے زمانے کتنے جگ اس گھر میں دم لے رہے تھے۔ وہ چپ ہوئیں تو جیسے اس گھر میں کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہی۔ سب زمانے روپوش ہو گئے۔ میں نے اپنی طرف سے انہیں چھیڑا بھی۔ وہ باتیں بھی کیں جو ان کے تخیل کے لیے قحبی کا کام کرتی تھیں۔ چراغ حویلی کا ذکر بھی چھیڑ کر دیکھ لیا۔ ذرا جو بولی ہوں۔ لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ ہاں ایک دن خود ہی شروع ہو گئیں۔ کتنی دیر سے چپ بیٹھی تھیں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگیں:

"آجکل چراغ حویلی خواب میں بہت آ رہی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ رات کیا دیکھا کہ جیسے حویلی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ راج مزدور لگے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے صفائی ستھرائی ہو گئی ہو۔ کیسی چمک دمک تھی ماشاءاللہ مردانے کے صحن میں چھڑکاؤ پہ چھڑکاؤ میں جیسے ملاں سے کہہ رہی ہوں کہ بہشتی جی کتنی مشکیں انڈیلو گے۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ مشک خالی کی اور پھر کنوئیں پہ ڈول بھر بھر مشک میں، اور پھر مشک سے صحن میں چھڑکاؤ۔ پھر جیسے میاں جان ہیں۔ تخت پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ چہرے پہ ایسی رونق کہ کیا بتاؤں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ کتنی شفقت سے کہا کہ بہو تم آ گئیں۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔"

بوجان چپ ہو گئیں۔ خیالوں میں غرق ہو گئیں۔ پھر خود ہی بولنے لگیں:

"پرسوں رات کی بات ہے۔ دیکھا کہ جیسے رات کا وقت ہے۔ حویلی کا بڑا پھاٹک بھاڑ سا کھلا ہوا۔ اندر اندھیرا۔ میں حیران ہو کے کہہ رہی ہوں کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ آج

حویلی کا پھاٹک کھلا پڑا ہے اور ڈیوڑھی میں لالٹین بھی نہیں جل رہی۔ اندر سے دل دھکڑ پکڑ کرے کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ پھر جیسے حویلی میں اکیلی بھٹک رہی ہوں۔ چلا رہی ہوں کہ اری او سکینہ، تو کہاں مر گئی۔ چولھا ٹھنڈا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں جھاڑو بھی نہیں لگی ہے۔ کب ہنڈیا چڑھائے گی، کب کھانا پکے گا۔ اسے لو! ابھی میں سکینہ کو آواز دے ہی رہی ہوں کہ میری آنکھ کھل گئی"۔

پھر چپ۔ گم سم۔ اپنے خیالوں میں غرق۔

یہ بوجان کی آخری گفتگو تھی۔ پھر نہیں بولیں۔ بیٹھی ہوئی یوں لگتیں کہ یہاں نہیں ہیں، کہیں اور پہنچی ہوئی ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ کہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ جسم یہاں تھا، روح چراغ حویلی میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ اصلی بوجان تو چراغ حویلی ہی میں تھیں۔ ان دنوں کیا دبدبہ تھا ان کا۔ نوکر چاکر، چھوٹے بڑے سب ان کے رعب میں رہتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے کہے کو ٹال جائے۔ حویلی میں زنانے سے مردانے تک ان کا حکم چلتا تھا میاں جان تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ بھی وہی تھیں۔ تو اصلی بوجان تو وہ تھیں۔ یہ تو ان کی پرچھائیں تھی۔ جیسے اصلی بوجان وہیں حویلی میں رہ گئی ہوں۔ صحت گرتی جا رہی تھی۔ بدن پہ پہلے بھی ایسی کونسی بوٹی چڑھی ہوئی تھی مگر اب تو خدا جھوٹ نہ بلوائے بدن پہ تولہ بھر گوشت بھی نہیں تھا۔ سوکھ کے چرخ ہو گئی تھیں۔ خوراک سمجھو کہ چڑیا کا چگا۔ چلنا پھرنا بھی اب موقوف تھا۔ نہیں تو گھر کے اندر ٹخ ٹخ چلتی ہی رہتی تھیں۔ صحن کے بیچ کھڑے ہو کر انگلی اٹھا کر دعا پڑھنے کا ورد بھی معطل ہو چکا تھا۔ بلکہ اب تو نماز بھی بیٹھے بیٹھے ہی پڑھ لیتی تھیں۔ بالکل ہی تھک گئی تھیں۔ مگر کسی حال میں بھی ہوتیں ہر دم ہر گھڑی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔

اس دن بھی چوکی پہ بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میرے ساتھ ٹھیکیدار کو گھر کے اندر آتے اور اندر باہر کا جائزہ لیتے دیکھا تو جیسے ہونٹ ایکدم سے سل گئے ہوں۔

پورا جسم ساکت۔ بس آنکھیں حرکت میں تھیں جیسے ٹھیکیدار کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہوں۔
اس میں میرا ارادہ شامل نہیں تھا۔ بس وہ پراپرٹی ڈیلر کسی گاہک کو لے کر ایک دم سے آن دھمکا۔ کس بے تکلفی سے تعارف کرایا:

"بختیار صاحب، یہ ہیں ہمارے اخلاق صاحب۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "اخلاق صاحب! یہ اپنے بختیار صاحب آشیانہ دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ میں نے کہا کہ چلیے ابھی دکھائے دیتے ہیں۔"

"کس سلسلہ میں۔ میں اسے فی الحال بیچنے کی تو کوئی نیت نہیں رکھتا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میں نے کب کہا کہ آپ اسے بیچ رہے ہیں۔ میں نے بختیار صاحب کے سامنے آپکے مکان کی تعریف کی۔ انہوں نے مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ گھر کی بات ہے۔ اخلاق صاحب سے ایسی کوئی غیریت تو ہے نہیں۔"

میں نے تامل کیا۔ میرے تامل کو دیکھ کر بختیار صاحب خوش اخلاقی سے بولے:

"جناب ہم آپ سے زبردستی کوئی سودا تو کرنے نہیں آئے ہیں۔ مگر اپنے ڈیلر صاحب نے آپ کے مکان کی اتنی تعریف کی کہ میرا بے ساختہ جی چاہا کہ چل کر اس مکان کو دیکھا جائے۔"

ڈیلر نے فوراً ٹکڑا لگایا: "بختیار صاحب آپ دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔"

"مکان اچھا ہو تو اسے خواہ مخواہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مکان خریدنا یا بنانا ہو تو اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ ایک تصور قائم ہو جاتا ہے کہ مکان ایسا ہونا چاہیے۔"

پھر میں انکار نہ کر سکا۔ مکان دکھایا۔ بختیار صاحب نے دیکھا۔ ساتھ میں پراپرٹی ڈیلر نے بھی۔ اس نے بھی پہلی مرتبہ ہی یہ مکان اندر باہر سے دیکھا تھا۔ بغیر دیکھے ہی اس نے بختیار صاحب کے سامنے اس مکان کی تعریف کے پل باندھ ڈالے تھے۔ بہرحال بختیار صاحب مکان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دیر تک باتیں کیا کیے۔ مکان کی تعریف کرتے رہے۔ مشورہ دیا کہ بیچئے مت۔ ایسے مکان روز روز نہیں بنائے جا سکتے۔ مگر

چلتے چلتے ٹکرا لگا گئے: "ویسے اگر کبھی یہ مکان نکالنے کا خیال ہو تو مجھے ضرور یاد کیجیے۔"

مختیار صاحب اور پراپرٹی ڈیلر کو رخصت کر کے جب میں اندر آیا تو دیکھا کہ بوجان چوکی پہ گم سم بیٹھی ہیں۔ میں سٹپٹا کر فوراً شروع ہو گیا:

"یہ صاحب پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپکے۔ پراپرٹی ڈیلر نے انہیں لا کے مجھ پہ مسلط کر دیا۔ مصر تھے کہ آپ کا گھر دیکھنا ہے۔ میں نے کہا دیکھ لیجیے مگر یہ مت سمجھیے کہ میں مکان کو بیچ رہا ہوں۔" میں نے جلدی جلدی یہ ساری باتیں ایسے کہیں جیسے بوجان کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں۔

بوجان نے ذرا جو کسی ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہو۔ بس ایک دفعہ مجھے دیکھا ضرور ایسی نظروں سے کہ میں ڈھے ہی تو گیا۔ پھر اٹھیں اور آہستہ آہستہ چل کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

زبیدہ جیسے بوجان کے جانے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی بڑے بے صبرے پن سے پوچھا:

"اخلاق۔ انھوں نے کیا قیمت لگائی؟"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہمیں بیچنا ہی ہے تو سوچ سمجھ کے بیچیں گے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی منہ اٹھائے چلا آئے۔ قیمت لگائے اور ہم بیچ دیں۔"

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہم بے سوچے سمجھے اونے پونے بیچ دیں۔ ٹھوک بجا کے سودا کریں گے۔"

"ماں نہ مان میں تیرا مہمان۔ مجھے تو پراپرٹی ڈیلر پہ بہت غصہ آیا۔ پہلے اس نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ کسی گاہک کو مکان دکھانے کے لیے لے کر آ رہا ہے۔ غیر آدمی کے سامنے اسے میں کیا کہتا۔ مروت میں مکان تو دکھا دیا مگر صاف کہہ دیا کہ فی الحال بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھا کیا۔ آنے والے کو بھی احساس رہے کہ ہم کوئی بہت ضرورتمند نہیں ہیں۔

اور بیچنے کی کوئی عجلت نہیں ہے۔ عجلت میں اچھے پیسے نہیں ملتے۔ مگر اندازہ تو کیا ہوتا کہ کیسی اسامی ہے۔ کتنے میں خریدنے کی نیت رکھتا ہے۔"

"خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ کونسا بھاگا جا رہا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی مجھے بوجان کا خیال آیا۔ "لگتا ہے کہ آج بوجان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ زبیدہ کچھ کہتی میں اٹھا اور بوجان کے کمرے کی طرف ہو لیا۔

بوجان اس شام اپنے کمرے میں ایسی گئیں کہ پھر باہر نہیں نکلیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو ان کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی۔ پھر بگڑتی ہی چلی گئی۔

ہم دونوں نے تین راتیں ان کے سرہانے سوتے جاگتے گذاریں۔ زبیدہ نے حق یہ ہے کہ ان تین دنوں میں ان کی بہت خدمت کی۔ دل میں جو ایک پھانس پڑ گئی تھی وہ تو پہلی ہی رات نکل گئی۔ کس بے قراری کے ساتھ بوجان کی حالت کو اور گھڑی کی سوئی کو دیکھتی رہی۔ بار بار دعا کرتی کہ الٰہی رات خیریت سے گذر جائے۔

پہلی رات۔ دوسری رات۔ تیسری رات۔ بوجان کی پٹی تھی اور ہم دونوں تھے پوری رات آنکھوں میں کٹتی تھی۔ خیر اصل دیکھ بھال تو زبیدہ کر رہی تھی۔ میں تو بس اس کا حوصلہ بندھانے کے لیے پاس رہتا تھا۔ کچھ سوچتا ہوا کچھ جاگتا ہوا۔ ہاں تیسرے دن ہم دونوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ ایک تیسرے نے آ کر ہمارا بوجھ بٹا لیا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا کہ دروازے پر کوئی کار آ کر رکی۔ ہارن کی آواز پر میں باہر گیا اور حیران رہ گیا:

"ارے شیریں تم؟"

"اب تم ہر مرتبہ مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرو گے۔" اور فوراً ہی لہجہ بدل کر بولی۔ "تائی اماں کا کیا حال ہے؟"

"دیکھو چل کر۔ ویسے تمہیں کس نے بتایا؟"

میرے اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی اندر گئی اور بوجان کے پلنگ کے پاس پہنچ کر ان پر جھک گئی۔

"تائی اماں۔ تائی اماں۔ آپ کیسی ہیں؟"

تائی اماں ہوش میں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ وہیں پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر گم بیٹھی رہی پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئی: "کب سے یہ حال ہے؟"

"دو دن ہو گئے۔ اچھی بھلی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے تو کوئی ایسا گمان بھی نہیں ہوا۔ اخلاق نے کہا کہ بوجان کی طبیعت ٹھیک نظر نہیں آتی۔ اندر آ کے دیکھا تو وہ تو بخار میں بھن رہی تھیں۔ بس پھر حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔"

"کس ڈاکٹر کو دکھایا۔ کیا کہتا ہے۔ ہسپتال میں داخل کیوں نہیں کرایا۔" کتنی دیر تک یہی پوچھ گچھ کرتی رہی۔

"میں نے جب بوجان سے ذکر کیا کہ شیریں اسی شہر میں ہے تو بہت خوش ہوئیں۔ پھر بگڑنے لگیں کہ ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔ روز پوچھتی تھیں کہ شیریں آئی نہیں۔ کیا بات ہے۔"

"ہاں مجھے سب سے پہلے تو تائی اماں کے پاس آنا چاہیے تھا۔"

"اس روز تو تم نے کمال کیا۔ ایسی اوجھل ہوئیں کہ میں ڈھونڈتا پھرا، تم کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ بہرحال تم نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیوں نہیں آئیں۔"

جواب میں اس نے مجھے ایسی تیز نظروں سے دیکھا کہ میں سٹپٹا گیا۔ میں نے فوراً بات بدلی: "زبیدہ۔ شیریں کے لیے چائے بناؤ۔"

"نہیں بھابی نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"لو۔ کیوں نہیں پیو گی؟"

"بیماری کے گھر میں ایسے تکلفات اچھے نہیں لگتے۔"

"نہیں۔ تکلفات بالکل نہیں ہوں گے۔ سیدھی سیدھی چلئے ہوگی۔"

"آپ لوگ مجھے مہمان سمجھ رہے ہیں۔ میں یہاں تائی اماں کی خدمت کرنے کے لیے آئی ہوں۔ میں رات کو یہیں رہوں گی تم لوگوں کو دو راتیں جاگتے گذر گئی ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔" زبیدہ نے کہا۔ "ایسے وقت میں جاگنا پڑتا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بیٹے بہو ہیں مگر تائی اماں میری بھی کچھ لگتی ہیں۔ کچھ ان کا حق مجھ پر بھی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں شیریں ایسے ہوگئی جیسے وہ بہت دنوں سے یہاں رہ رہی ہو۔ اپنی تائی اماں کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زبیدہ سے کہا: "بھابی، آپ گھر کا کام دیکھیں۔ تائی اماں کو مجھ پر چھوڑ دیں۔"

زبیدہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ گھر جو دو دنوں سے اجڑا پڑا تھا اسے درست کرنے لگی۔ وقفوں سے کمرے میں جھانک جاتی: "شیریں میری ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر اپنے کام کریں۔"

ہنڈیا روٹی اور گھر کے دوسرے کاموں سے فراغت پاکر جب زبیدہ آکر بیٹھی تو شیریں نے جلدی ہی اسے آرام کرنے کا نوٹس دیدیا: "بھابی آپ دو رات کی جاگی ہوئی ہیں۔ آپ اپنے بستر میں جاکر فوراً سو جائیں۔"

"کیسے سو جاؤں۔ مجھے تو حالت سنبھلتی نظر نہیں آتی۔ پتہ نہیں رات کیسے گذرے۔"

"آپ سوئیں۔ میں جاگوں گی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو آپ کو اٹھالوں گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اخلاق تم بھی آرام کرو۔"

"بس تم اپنی بھابی کو سُلا دو۔ اس غریب نے دو راتوں سے آنکھ نہیں جھپکی۔ میں تو سوتا جاگتا رہا ہوں۔ آج بھی یہی کروں گا۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے بھی سو لیتا ہوں۔"

"ہاں۔ پتہ ہے"۔ بہت بے تعلقی سے اور کسی قدر آہستہ سے کہا۔ پھر فوراً ہی زبیدہ کی طرف رُخ کر لیا۔ "بھابی۔ آپ آرام کریں"۔

زبیدہ تھوڑی ہچر مچر کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ اچھا ذرا بیٹھ لگالوں، قریب پڑے پلنگ پہ لیٹ گئی اور فوراً ہی ایسی سوئی کہ خراٹے لینے لگی۔

ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے بات نہ کر سکے۔ شیریں نے کافی دیر تک اپنے آپ کو بوجان کی تیمارداری میں مصروف رکھا۔ میں دیکھتا رہا کہ کس طرح وہ تیمارداری کے بہانے اپنے آپکو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"شیریں۔ بوجان نے پچھلے دنوں تمہیں بہت یاد کیا"۔ آخر میں نے زبان کھولی۔

شیریں جیسے شرمندہ ہو گئی، آہستہ سے بولی: "ہاں مجھے آنا چاہیے تھا"۔

"پچھلے چند دنوں سے انہیں خاندان والے بہت یاد آ رہے تھے۔ ایک ایک کا نام لیا۔ ایک ایک کو یاد کیا۔ پھر ایک روز بیٹھے بیٹھے کہنے لگیں کہ نہ جانے کیا بات ہے آجکل خواب میں چراغ حویلی مجھے بہت دکھائی دے رہی ہے"۔

"چراغ حویلی"۔ شیریں نے آہستہ سے کہا اور اس انداز سے جیسے اسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "شیریں، تمہیں چراغ حویلی یاد ہے؟"

"یاد کیوں نہ ہوتی۔ میں اتنی بچی تو نہیں تھی۔ مجھے وہاں کی ان دنوں کی ایک ایک بات یاد ہے"۔

"اچھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔

مگر اس نے میرے ردِ عمل پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ یادوں کے رستے پر چل پڑی تھی۔ اس کے لہجے سے بے تعلقی کا رنگ غارج ہو چلا تھا۔ "اخلاق تمہیں یاد ہے جب

حویلی کی ممٹی پہ ایک دن مور آ کے بیٹھا تھا اور ہم نے کہا کہ آؤ اسے پکڑتے ہیں"۔ یہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے بدل گئی۔ اس کا وہ لیا دیا پن، وہ غیریت کا احساس بالکل ہی غائب ہو گیا۔ وہی بھولپن، وہی لہک جیسے اُس وقت کی شیرینی واپس آ گئی ہو۔ "کتنے چپکے چپکے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے ہم چھت پہ گئے تھے۔ یہ لمبی دُم اور ایک دم سے نیلی۔ بس دم کو پکڑنے لگے تھے کہ پھر سے اُڑ گیا"۔

اس کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ پورا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ چراغ حویلی کی اونچی چھت، ممٹی پر بیٹھا ہوا مور، اس کی جھاڑ جیسی گھنی لمبی نیلی دم۔ اور جب وہ اچانک اُڑا تو بالکل ایسے لگا جیسے کوئی نیلا جزیرہ ہوا میں بہتا چلا جا رہا ہے۔

"اخلاق۔ اسے ہمارے آنے کا پتہ کیسے چل گیا تھا۔ ہم نے تو اپنے قدموں سے ذرا آہٹ نہیں ہونے دی تھی"۔

"ہمارا اسے پتہ نہیں چلا تھا"۔

"پھر؟"

"اسی وقت دور سے میاؤں میاؤں کی آواز آئی تھی نا؟"

"ہاں بالکل۔ میاؤں میاؤں کی آواز سنائی دی تھی"۔

"مورنی نے اسے پکارا تھا۔ وہ اس پکار کو سن کر تڑپ گیا"۔

"مور اپنی مورنی کو اتنا چاہتا ہے نا؟"

"ہوں"۔

ہم دونوں ہی اس فضا میں پہنچ گئے تھے یا جیسے اس نے مجھے انگلی سے پکڑا اور یادوں کی ہری بھری وادی میں اتر گئی۔ یادوں کی ہری بھری وادی میں قدم سے قدم ملا کر ایک لمبا سفر۔

"اخلاق تمہیں یاد ہے وہ جو ایک سُن ماچڑیا منڈیر پہ آ کے بیٹھا کرتی تھی، دم آ ہے

شام پری کہا کرتے تھے۔"

"شام پری کو میں نے پکڑنے کے لیے بہت جتن کیے مگر وہ ہمیشہ جُل دے جاتی تھی۔"

شیریں کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر ایکدم سے سنجیدہ ہو گئی:

"اخلاق:"

میں گھبرا گیا: "ہاں"۔

"حویلی میں جو کنواں تھا وہ تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے"۔

"کیا واقعی اس کے اندر جن رہتے تھے"۔

"پتہ نہیں۔ ویسے اس وقت میں یہی سمجھتا تھا"۔

"اس وقت ہم کتنے بے وقوف تھے۔ سمجھتے تھے کہ کنوؤں میں جن رہتے ہیں"۔

"اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے"۔

"ہاں۔ اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ دنیا کی کسی بات کا پتہ نہیں تھا۔ شاید انہیں دنوں ہم اچھے تھے"۔ شیریں اداس ہو گئی۔

ایک یاد سے دوسری یاد، دوسری یاد سے تیسری یاد، کس طرح سب یادیں ایک دوسری میں بندھی ہوئی، آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ موتیوں کی ایک لمبی لڑی کچھ سلجھی ہوئی کچھ الجھی ہوئی۔ یادیں امنڈ گھمنڈ آتی چلی جا رہی تھیں۔

"اخلاق تمہیں یاد ہے حویلی کے احاطے میں وہ جو پیڑ تھے نا، کتنے گھنے اونچے پیڑ تھے۔ وہ جو آم کا پیڑ تھا کتنا ہرا بھرا اور گھنا تھا۔ ایک دفعہ ہم چڑھتے چڑھتے کتنے اونچے چڑھ گئے تھے"۔ اور یہ کہتے کہتے وہ اچانک رک گئی۔ میں بھی ٹھٹھک گیا۔ ایک دم سے سب کچھ یاد آ گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شیریں نے نیا نیا دوپٹہ اوڑھنا شروع کیا تھا۔ سینہ

اب ڈھکار رہنے لگا تھا اور ناک میں نیم کا فقط تنکا۔ انہیں دنوں ناک چھدی تھی۔ میری انگلی بار بار اس کی ناک پر جاتی تھی۔ کتنا بدکتی تھی میری اس حرکت سے: "مت چھو جی۔ میری ناک دُکھتی ہے"۔ اصل میں نیم کے تنکے کے اردگرد جو جگہ سرخ ہو گئی تھی اسے چھونا مجھے اچھا لگتا تھا۔ پھر جب وہ بدکتی تھی تو اور بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ ایک گرم دوپہر تھی۔ ہم دونوں خس کی ٹٹیوں والے بڑے کمرے سے چپکے سے نکل کر احاطہ میں پیڑوں کی چھاؤں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے گھنے آم کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ بڑی بڑی امیاں ٹپک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ کس طرح لہراتی تھیں۔

"آؤ امیاں توڑیں"۔ میں نے تجویز پیش کی۔

"بہت اونچائی پہ ہیں"۔

"پھر کیا ہوا؟"

سہارا دے کر شیریں کو تنے سے اوپر کھسکایا۔ پھر خود لپک کر چڑھ گیا۔ پھر ہم دونوں ایک گدے سے دوسرے گدے پر، دوسرے گدے سے تیسرے گدے پر چڑھتے چلے گئے۔

"بس بھئی۔ اب اور اوپر نہیں جائیں گے نہیں تو گر پڑیں گے"۔

واقعی ہم بہت اوپر چلے گئے تھے۔ اور پتوں میں چھپ گئے تھے۔ پتوں میں چھپے ایک ڈال پہ پاس پاس بیٹھے ہم امیاں توڑ کے کھاتے رہے۔

"بہت کھٹی ہے"۔ اس نے منہ بگاڑ کے کہا۔

"پھر میں چکھوں"۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لپک کر امیا اپنے منہ میں رکھ لی۔

"کوئی بھی کھٹی نہیں ہے۔ بہت مزے کی ہے"۔

"ہماری امیا ہمیں دیدو"۔

میں اس کی درخواست کو خاطر ہی میں نہیں لایا۔ کتر کتر کے مزے لے لے کر

کھانا چلا گیا۔ اس نے چھیننے کی، میں نے بچانے کی کوشش کی۔ اس چھینا جھپٹی میں میرا ہاتھ اس کی ناک پر جا لگا۔ وہ تڑپ ہی تو گئی۔

"اوئی مر گئی"۔

"چوٹ لگ گئی۔ اچھا لا، میں ٹھیک کرتا ہوں"۔ میں نے انگلی کی پور منہ کی بھاپ سے گرم کی اور چھدرے ہوئے نتھنے پر اسے آہستہ آہستہ پھیرا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ۔ اسے آرام آتا چلا گیا۔ آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ میں نے منہ ناک کے قریب لا کر دکھتی جگہ کو بھاپ دینی شروع کر دی۔ پھر آہستہ سے ہونٹ اس جگہ پر رکھ دیے۔ کتنی دیر رکھے رہا۔ ہم دونوں اس تنگ جگہ میں ایک گدے پہ بیٹھے بیٹھے کتنے قریب آ گئے تھے۔ جیسے ایکدوسرے کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ دوپٹہ سرکتے سرکتے نیچے جا گرا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ الگ سرکتے ہوئے کہا: "ہٹ، میرا دوپٹہ گر گیا"۔ بغیر دوپٹے کے اسے دیکھ کر میں کتنا حیران ہوا۔ یہ وہی شیریں تھی کہ جب ابھی دوپٹہ اوڑھنا شروع نہیں کیا تھا تو بالکل لڑکوں کی طرح لگتی تھی اور اب..... اس نے مجھے گھورتے دیکھا تو سٹپٹا گئی: "بے شرم"۔ اور درخت سے نیچے اتر گئی۔

ہم دونوں یادوں کی شاداب وادی سے واپس آ گئے تھے مگر سٹپٹائے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی یہ واقعہ گذرا ہے۔ شیریں کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو اس نے بوجان کی نبض دیکھنی شروع کر دی۔ پھر سانس کی آواز کو غور سے سنا۔ گھبرا گئی:

"اخلاق دیکھو، تائی اماں کے سانس کی آواز کیسی ہے؟" پھر بہت عجلت میں زبیدہ کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "بھابی، ذرا اٹھو تو سہی"۔

زبیدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "کیا بات ہے؟"

"ذرا آ کے دیکھو"۔

زبیدہ دوڑ کے بوجان کے سرہانے پہنچی۔ سانس کی آواز غور سے سنی سخت تشویش

کے لہجہ میں بولی: "یہ تو سانس چل رہا ہے۔"

میں نے گھڑی پہ نظر ڈالی۔ "اب تو صبح ہونے کو ہے ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

فون کی طرف لپکا۔ ڈائل بار بار گھمایا۔ نمبر نہیں مل رہا تھا۔ شیریں نے پکارا:

"اخلاق ٹیلی فون کو چھوڑو۔ یہاں آ کے تائی اماں کے قریب بیٹھو۔"

میں نے شیریں کے لہجہ کی گھمبیرتا سے اندازہ لگایا کہ بوجان پر کونسی گھڑی گذر رہی ہے۔ ٹیلی فون چھوڑ خاموشی سے بوجان کے قریب آ کر سرہانے کھڑا ہو گیا۔

ہم تینوں کھڑے رہے۔ بوجان کا سانس چلتا اکھڑتا دیکھتے رہے۔ سانس چلنا آخر کے تئیں بند ہو گیا۔ شیریں نے جھک کر دیکھا۔ جسم کو چھوا۔ پھر یوں کیا کہ بہت آہستہ سے بوجان کی آنکھیں بند کیں، گردن بہت دھیرے سے سیدھی کی:

"بھابی پیر سیدھے کر دو۔"

اور پورے بدن کو چادر سے ڈھانک دیا۔ اس طرف سے فراغت پا کر میرے قریب آئی۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "اخلاق۔ تائی اماں ہمیں چھوڑ گئیں۔" اور میرے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے کتنی مشکل سے اسے سنبھالا۔

تھوڑی دیر میں شیریں خود سنبھل گئی۔ دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں۔ ایک احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور بہت سنجیدگی سے مجھے اور زبیدہ کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔

"اخلاق عزیزوں کو اطلاع کر دو۔"

اس ہدایت نے مجھے بوکھلا دیا۔ "ہمارے کون عزیز ہیں اس شہر میں۔ مجھے تو کسی کے متعلق معلوم نہیں ہے۔"

"میں بتاتی ہوں۔ فون لاؤ۔"

میں فون اٹھا لایا۔ اس نے پرس سے ڈائری نکالی۔ نام لے لے کر فون نمبر بتاتی گئی۔

میں ڈائل گھماتا گیا۔ میں حیران تھا اتنے زمانے سے اس شہر میں رہ رہا تھا اور احساس ہی نہیں تھا کہ اس شہر میں ہمارے کتنے عزیز موجود ہیں۔ وہ انہیں دنوں اس شہر میں وارد ہوئی تھی اور اس کے پاس ایک ایک عزیز کا پورا پتہ معہ فون نمبر کے موجود تھا۔

"شیریں۔ تم کل بھی دفتر نہیں گئیں۔ آج بھی نہیں گئیں۔ اپنے دفتر کو اطلاع تو دیدی ہوتی۔ مجھے نمبر بتاؤ۔ میں فون کر دوں"۔

"دفتر کو اطلاع ہے۔ جب مجھے پتہ چلا تھا تب ہی مجھے ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا دفتر میں اطلاع کر کے ادھر آئی تھی۔" رکی، پھر بولی: "میں کتنی دور سے کھنچ کر یہاں پہنچی ہوں۔ بے فکر نیویارک میں بیٹھی تھی۔ سان نہ گمان۔ اچانک اپنے انٹی ٹیوٹ کی سرد سے ٹیم کا ادھر کا دورہ نکل آیا اور میرا نام اس میں آگیا۔ بس تائی اماں کی صورت دیکھنی تھی۔ . . . ان کی صورت تو دیکھ لی۔ اپنی صورت نہیں دکھا سکی۔ . . . . بس مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ جیسے آپ یہاں آئی تھی ویسے ہی پہلے میں ادھر آجاتی۔ کئی دفعہ ارادہ بھی کیا مگر۔ . . . ." کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

زبیدہ کہنے لگی: "آخری دنوں میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر یاد کرتی تھیں۔ تمہارے بارے میں کتنی مرتبہ اخلاق سے پوچھا، اے بیٹے، شیریں کا پتہ کر دو ادھر آئی کیوں نہیں؟"

"ہاں۔ بزرگ تو بچوں بڑوں سب کو یاد رکھتے ہیں۔ خاندان کتنا بکھر گیا تھا۔ مگر ایک ان کی ذات کی وجہ سے آپس میں ایک تعلق قائم تھا، جیسا کیسا بھی تھا۔ تائی اماں اس خاندان کی آخری بزرگ تھیں۔ . . . . ہمارے سروں پر آخری سایہ۔ اب ہمارے سروں پر

کوئی سایہ نہیں ہے"۔ شیریں کی آواز بھرانے لگی تھی چپ ہوگئی۔

"بہت ڈھارس تھی ان کے دم سے۔ بوجان نہ ہوتیں تو اللہ قسم میرا تو اس گھر میں دم الٹ جاتا"۔

"بھابی، آپ نے بوجان کا حویلی والا زمانہ نہیں دیکھا۔ حویلی انہیں کے دم سے حویلی نظر آتی تھی۔ اخلاق، تمہیں یاد ہے۔ ان کی ڈانٹ سے ہماری میّا مرجاتی تھی۔ باپ رے باپ جتنی مہربان تھیں اتنی ہی سخت بھی تھیں۔ جب اپنے چھپر کھٹ پہ سامنے پاندان رکھ کر اور ہاتھ میں سروطہ لے کر بیٹھتی تھیں تو کتنا دبدبہ ان سے ٹپکتا تھا اور کس وقار کے ساتھ حکم دیتی تھیں۔ نوکر چاکر، چھوٹے بڑے، سب کی ایک ایک حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی"۔

"مگر یہاں آکر بالکل بدل گئی تھیں"۔ میں نے بتایا۔ "کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتی تھیں بس جیسے حویلی سے نکل کر مرجھا گئی ہوں۔ پھر مرجھاتی ہی چلی گئیں"۔

"وہاں کتنی سرخ و سفید تھیں۔ اور اشرفی کی جھینٹ والے تنگ پائجامہ میں انکی پنڈلیاں کتنی کسی کسی نظر آتی تھیں"۔

"اب تو یہ حال تھا" زبیدہ نے کہا "کہ ہڈیاں ہی ہڈیاں۔ تولہ بھر گوشت رہ گیا ہوگا۔ باقی ہڈیاں ایسی کہ ایک ایک گن لو"۔

بوجان اپنے چرخ بدن کے ساتھ میرے تصور میں گھوم گئیں: "عمر کا سفر بھی کتنا تباہ کن ہوتا ہے اور وقت آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر ڈالتا ہے"۔

"ہاں وقت"۔ شیریں بس آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہوگئی اور افسردہ بھی۔

شیریں ہمارے ساتھ سیم تک رہی۔ کتنا گھل مل کر رہی جیسے برس برس سے ہم اسی طرح

گلے ملے چلے آرہے ہیں۔ غیریت کا، دوری کا ذرا جو احساس نے ہونے دیا ہو۔ ہر وقت باتیں۔ ان دو ڈھائی دنوں میں کتنی باتیں کر ڈالی تھیں ہم نے۔ سب چراغ حویلی کے دنوں کی باتیں۔ ہر بات کی ایک ایک تفصیل۔ اپنے سارے بچپن لڑکپن کو کھوند ڈالا۔ مگر اس سفر میں ہم دونوں ایک مقام پر جاکر رک جاتے تھے۔ بس ایک دفعہ میں نے جھجکتے جھجکتے اس سرحد کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر شیریں نے اتنی تیزی سے بات کاٹی کہ دوبارہ سرحد عبور کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔

سویم کے دوسرے دن اس نے اپنے دفتر فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی دروازے سے آن لگی۔

"لو گاڑی آگئی۔ بھابی میرا جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا مگر دفتر کی وجہ سے جانا پڑ رہا ہے۔"

زبیدہ نے کتنے تشکر آمیز لہجہ میں کہا: "شیریں، تم نے ہمارا بہت ہاتھ بٹایا۔ تم نہ ہوتیں تو ہم کیا کرتے۔ یہاں کون تھا ہمارا۔ جب بوجان کی حالت بگڑی تھی تو میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ اگر ایسی ویسی بات ہوگئی تو میں اکیلی کیا کروں گی۔ اللہ قسم تم تو بالکل رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں۔"

"بھابی۔ تم تو ایسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ اور میں نے آکر کیا کیا۔ تائی اماں نے تو مجھے خدمت کا موقعہ ہی نہیں دیا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

جب وہ کار میں بیٹھنے لگی تو میں نے تقریباً کار کے اندر منہ ڈال کر آہستہ سے کہا جیسے راز کی بات ہو:

"سنو!"

"ہاں۔" اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"آؤ گی؟"

تامل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا: "اچھا۔"